جناب ڈاکٹر ابو سلمان

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

سیرت و خدمات پر ایک سرسری نظر

(۲۰ جون ۱۹۸۶ء کو یہ مقالہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی سیمینار (کراچی) میں پڑھا گیا)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا وہ اپنے علم و فضل، اخلاق و سیرت، جامعیت علم و فن اور علمی و تعلیمی خدمات کے لحاظ سے نہ صرف علماء دیوبند میں بلکہ علمائے عصر میں ممتاز و فائق تھے۔

پیدائش و وطن | مولانا اکبرآبادی کا آبائی وطن ضلع مراد آباد (یوپی) کا قصبہ بچھرایوں تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں بمقام آگرہ ہوئی۔ جہاں ان کے والد ڈاکٹر ابرار حسین میڈیکل پریکٹس کرتے تھے۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ اکبرآبادی کا لاحقہ مولد و منشائے طفولیت اور اولین معہد تعلیمی کی نسبت لگاتے تھے۔

تعلیم | مولانا اکبرآبادی کی تعلیم کا آغاز آگرہ (اکبرآباد) سے ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی سے السنہ شرقیہ کے امتحان پاس کئے۔ اس سلسلہ میں کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا۔ اسی دوران میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن میں شریک ہوئے۔ بعد ازاں انگریزی زبان کی تحصیل کی طرف توجہ فرمائی۔ اور گریجویشن کیا۔ اور والد کی خواہش کے مطابق دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ جہاں اس عہد کے نامور علمائے حدیث و فقہ کے مشہور اساتذۂ ادب، فلسفہ و منطق اور اصحابِ علوم و فنون جمع تھے۔ یہ مولانا اکبرآبادی کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ انہیں مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، میاں اصغر حسین اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے علمائے عصر اور فضلائے دہر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہو گئے جہاں سے انہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اس طرح انہیں اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبان و ادب میں رسوخ اور رفتہ رفتہ تحریر و تقریر میں عبور حاصل ہو گیا۔

درس و تدریس | عملی زندگی کا آغاز دارالعلوم ڈابھیل کے عملۂ تدریس میں شرکت سے ہو چکا تھا۔ لیکن حصولِ علمی اور تکمیل علوم مغربی کے شوق میں یہ سلسلہ جلد ہی منقطع ہو گیا۔ اور سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہو گئے ایم اے کرنے کے بعد وہ اسی کالج میں استاد مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک دراز رہا۔ ۱۹۴۹ء میں وہ مولانا ابوالکلام

آزاد کے ایما پر کلکتہ تشریف لے گئے۔ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا اور دس گیارہ سال کی جد وجہد سے اس تاریخی مدرسے کو جو ۱۹۴۷ء کو بالکل بند ہو گیا جس کے طلبا و اساتذہ منتشر ہو گئے تھے از سرِ نو زندہ کیا۔ اور اسے ملک کا ایک مایۂ ناز ادارہ بنا دیا۔ ۱۹۵۹ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لے گئے۔ جہاں انہیں سنی دینیات کے شعبے کا صدر اور فیکلٹی آف تھیالوجی کا ڈین مقرر کیا گیا۔ علی گڑھ سے سبکدوشی کے بعد تقریباً چار سال تک ہمدرد دہلی کے ایک تحقیقی ادارے سے وابستہ رہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلق کے دوران ایک سال کے لئے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی نے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے انہیں اپنے ہاں بلا لیا۔ علی گڑھ سے دوسری بار علیحدہ ہوئے تو دارالعلوم دیوبند نے اپنے اس نامور فرزند کے لئے اس کے ذوقِ علمی اور عقیدت مذہبی کے مدِ نظر "شیخ الہند اکادمی" قائم کی اور انہیں اکادمی کا ڈائرکٹر بنایا۔ اس کے ساتھ دارالعلوم کے منتہی طلبہ اور اساتذہ کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی انقلابی تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کا درس بھی دیتے تھے۔

مولانا اکبر آبادی نے ملک اور بیرونِ ملک کے متعدد تعلیمی و تدریسی اسفار کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک کے علمی سفر کیے اور بیسیوں عالمی علمی کانفرنسوں میں شریک ہوئے اور سینکڑوں مباحثوں اور مذاکروں میں بھی انہوں نے حصہ لیا۔

تصنیف و تالیف | مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی پوری زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت سے ہزارہا نوجوان علمی و عملی زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی کے ساتھ گامزن ہوئے۔ لیکن ان کے ذہنی و فکری کمالات کا سب سے بڑا اظہار تصنیف و تالیف کے کاموں میں ہمیشہ مشغول رہے۔ انہوں نے ایک درجن سے زائد بلند پایہ علمی و تحقیقی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں صدیق اکبر، عثمان ذوالنورین۔ غلامانِ اسلام، اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، مسلمانوں کا عروج و زوال۔ وحی الٰہی۔ فہم قرآن، خطبات اقبال پر ایک نظر اور ہندوستان کی شرعی حیثیت بہت مشہور ہیں۔

تبصرہ | میں یہاں حضرت مرحوم کی تصانیف میں سے چند ایک کے بارے میں اظہارِ خیال کروں گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ پر ان کی کتاب کا بہ لحاظ جامعیت اردو میں کوئی جواب نہیں۔ علامہ شبلی نے حضرت عمر فاروقؓ جس زمانہ میں کتاب لکھی تھی ان کا ذہن تاریخ اسلام کی عظیم الشان شخصیات کے بارے میں ایک خاص انداز سے سوچ رہا تھا۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق مطلوبہ خصائص کی شخصیت حضرت عمر فاروقؓ ہی کی ہو سکتی تھی۔ اور معلوم ہے کہ انہوں نے "الفاروق" کی شکل میں اردو کے اسلامی لٹریچر میں جو اضافہ کیا ہے وہ نہایت درجہ بیش بہا ہے۔ شبلی نے حضرت فاروقؓ کی شخصیت و سیرت کے خصائص کا جو مرقع تیار کیا ہے وہ بے مثال ہے

شبلی نے اس کے علاوہ بھی اسلامی، تاریخی شخصیات وموضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ نہ لکھتے تب بھی صرف "الفاروق" اردو ادب میں ان کی دائمی بقا وحیات کے لئے کافی تھی۔ لیکن اگر علامہ شبلی کے مخصوص نقطہ نظر سے الگ ہو کر خالص علمی نقطہ نگاہ سے اس کے معیار کی جستجو کی جائے تو اس تالیف کے بعض پہلوؤں میں نقص کے احساس سے کوئی شخص اپنے قلب کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ لیکن حضرت شبلی کے اسلوب نگارش کی دل ربائی کا یہ عالم ہے کہ ان کی تالیف کی اس کوتاہی کی طرف نظر نہیں جاتی۔

سیدنا ابوبکر صدیق ؓ پر تالیف میں مولانا اکبر آبادی مرحوم کا نقطہ نظر شبلی مرحوم کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ مولانا اکبر آبادی نے کسی خاص سلسلہ وموازنہ ومقابلہ میں حضرت صدیق اکبر پر قلم نہیں اٹھایا بلکہ تاریخ اسلام کے ایک اہم موضوع اور عظیم المرتبت شخصیت اور اس کے ذہنی وفکری کمالات، دماغی صلاحیتوں، سیرت کے محاسن، اخلاق کے فضائل، ایثار جان ومال کے جذبے، انفاق فی سبیل اللہ کے ذوق، فکر وبصیرت کی وسعتوں، عزم کے رسوخ، فیصلے کی محکمی، سیرت کی استقامت، خدمات کی عظمتوں، شخصیت کی ہمہ گیریوں اور بعد کی تاریخ اسلام پر حضرت ابوبکر صدیق اکبر ؓ کے ہمہ گیر اثرات بغرضیکہ علم وفضل کے خصائص کبریٰ کی جامعیت میں اس تالیف کا درجہ اس سے بہت بلند ہے۔ معارف نے صدرجہ ذہنی تحفظ اور حضرت شبلی کے دفاع اور ندوۃ المصنفین پر دار المصنفین شبلی اکیڈمی کی فوقیت کے احساس کے ساتھ لکھا کہ علامہ شبلی نے الفاروق لکھ کر حضرت عمر ؓ کا حق تو ادا کر دیا تھا مگر ابوبکر صدیق ؓ کا ابھی حق باقی تھا۔ ہمارے فاضل دوست مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے یہ کتاب لکھ کر اس حق کو ادا کر دیا ہے۔ حالاں کہ کسی انصاف پسند اور حقیقت نگار کے ہاتھ میں یہ قلم ہوتا تو یہ نقش کچھ اس طرح نمایاں ہوتا کہ جس فاضل نے ابوبکر صدیق ؓ پر قلم اٹھایا تھا اگر وہ حضرت عمر فاروق ؓ کی شخصیت وسیرت پر قلم اٹھاتا تو حضرت کی ذہنی و دماغی صلاحیتوں اور علم وعمل کے خصائص کی جامعیت کا اسی معیار کا اس سے زیادہ خوبصورت مرقع تیار ہوتا۔

"الفاروق" کی شہرت اور مقبولیت میں علی گڑھ کے مرکز علم وتہذیب سے شبلی کی وابستگی، سرسید کی ستائش اور حالی کی پسندیدگی کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے۔ مولانا اکبر آبادی کی تصنیف کی مقبولیت اس کے باوجود ہے کہ انہیں نہ تو کسی منظم پروپیگنڈہ کرنے والی جماعت کی حمایت حاصل تھی نہ کسی ادارے کے وسائل تشہیر سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع انہیں میسر تھا اور اگر انہیں بھی سرسید اور حالی جیسا قدر دان مل جاتا تو ان کی تالیف کے کمال شہرت اور مقبولیت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

مولانا اکبر آبادی نے خلفائے راشدین میں حضرت عثمان غنی ؓ کی سیرت وخدمات کو بھی اپنے فکر ونظر کا موضوع بنایا ہے۔ اور "عثمان ذوالنورین" کے عنوان سے اردو ادب میں ایک بیش بہا تالیف کا اضافہ فرمایا ہے۔ حضرت علی

کرم اللہ وجہہ پر اپنے مطالعہ و تحقیق کی تالیف و تدوین میں مصروف تھے۔ اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اس کی تکمیل کے بعد وہ اپنے علم اور نظر کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ پر بھی ایک کتاب لکھ کر خلفائے راشدین کے سیٹ کو مکمل کر دیں گے۔ لیکن افسوس کہ اب تک فکر و نظر کا وہ ساقی ہی نہیں جس کا عشوہ طراز وجود مے خانۂ علم کی رونق اور سرگرمی کا موجب تھا۔ اب علم و فن کی ویسی جامعیت ہے نہ ذوق و نظر کے خصائص کی حامل ان کی سی کوئی شخصیت۔ اس لئے اس سلسلے کی تکمیل کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی ایک اہم تصنیف "اسلام میں غلامی کی حقیقت" ہے جس سے ان کے مطالعہ کی وسعت اور مسئلہ کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جدید دور نے اسلامی تعلیمات اور تاریخ اسلام کے جن واقعات پر جو تنقیدی نظر ڈالی ہے ان میں غلامی کا مسئلہ بھی ہے۔ بعض مستشرقین اور جدید الفکر اصحاب نے اس باب میں اسلام کو مطعون کیا ہے۔ لیکن دفاع اسلام کے مساعی حسنہ اور تاویلات کی مستحسن کوششوں کے سوا علمی نقطہ نظر سے کوئی سعی مشکور نہ ہوئی تھی۔ اس سلسلے کی ایک قابل قدر کوشش علی گڑھ کے مرکز علم و تہذیب سے گذشتہ صدی میں نقش پذیر ہوئی تھی لیکن ساعی مرحوم و محترم کے عدم واقفیت تاریخ و روایت اور عدم عبور تعلیمات اسلام کی بنا پر وقت کے افکار کا صحیح جواب وہ بھی نہ بن سکی تھی۔ اگرچہ یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ اسلامی ہند کے دور آخر میں مسلمان اہل علم و نظر کو اسی کوشش نے متوجہ کیا۔ لیکن اب تک جو چیزیں وجود میں آئی تھیں اور علمی نقطہ نظر ان میں مفقود تھا۔ اور بہ ایں درجہ علمی دنیا پر ابھی اس موضوع کا قرض باقی تھا۔ بارے خدا نے ہمارے ممدوح مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو اس جانب متوجہ کیا اور قلم اٹھانے کی توفیق ارزانی فرمائی۔

مولانا ممدوح نے غلامی کی روایت سے کامل واقفیت، تاریخ اسلام پر گہری نظر، اسلامی تعلیمات پر عبور اور اس موضوع پر قدیم و جدید لٹریچر میں رسوخ، بلکہ کہنا چاہیئے کہ کامل درجے کے رسوخ فی العلم کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اور اسلامی تعلیمات اور دور اسلام میں غلامی کی روایت کے بارے میں تمام شکوک و شبہات کو رفع کر دیا۔ انہوں نے اس کتاب میں دفاع تعلیمات اسلام کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن ان کا اسلوب بیان کسی جگہ پر بھی مدافعانہ نہیں، خالص علمی، تحقیقی اور تجزیاتی ہے۔

لیکن اس کتاب کو حضرت ممدوح کی دوسری تالیف "غلامان اسلام" کے ساتھ پڑھنا چاہیئے۔ خواہ پہلے خواہ بعد۔ یہ کتاب غلامی کے باب میں اسلامی تعلیمات کا صداقت نامہ ہے۔

مولانا اکبر آبادی کی تمام تصنیفات و تالیفات پر نقد و تبصرہ میرا موضوع نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو اس کے لئے نہ وقت ہے نہ فرصت۔ البتہ میں ان کی ایک تصنیف کے بارے میں مزید کچھ عرض کروں گا۔ مولانا کی یہ تصنیف "مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد" ہے۔ ایک صاحب نے بعض خاص جماعتی مصالح کی بنا پر

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی علیہ الرحمہ کے بارے میں معارف میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن وہ ضلالت میں مبتلا تھے۔ پہلے وہ سکھ مذہب کی ضلالت میں مبتلا تھے پھر دیوبند کی گمراہی نے ان کے وجود کا احاطہ کر لیا۔ شاید وہ سکھ رہتے تو اتنے برے نہ ہوتے اور مضمون نگار کو اعتراض بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ ان کے عقیدے میں مولانا محمد علی کے برعکس ایک فاسق و فاجر مسلمان سے کافر بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مرحوم نقاد کی جماعت اپنی نصف صدی کی تاریخ میں مسلسل مسلمانوں ہی سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔

بہرحال مولانا اکبرآبادی کے قلب پر ایک طرف تو اس مخصوص "اخلاقیات" کا اثر ہوا۔ دوسری طرف اس مضمون میں حقائق کو جس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا اور مولانا سندھی کے افکار کی جس طرح نافہمانہ اور جانبدارانہ ترجمانی کی گئی تھی۔ اس سے مولانا اکبرآبادی تڑپ اٹھے۔ برہان کی کئی قسطوں میں انہوں نے اپنے جگر لخت لخت سے صفحات کو سجایا اور اپنے افکار کے بولتے لالہ کو شگفتہ تحریر میں جس طرح پرو دیا ہے اس نے اصحابِ ذوق کے لئے نظارۂ جمال کا ایک خوشنما منظر پیش کر دیا ہے۔ یہ حضرت ممدوح کی ایک یادگار تصنیف ہے۔ جو اب نایاب ہونے کی حد تک کم یاب ہو گئی ہے۔

اب جب کہ حال ہی میں لاہور سے ہمارے بعض دوستوں نے اس تنقید کا پس منظر جانے بغیر اسے دوبارہ چھاپ دیا ہے تو ضرورت تھی کہ مولانا اکبرآبادی کا جواب بھی مناسب تعارف کے ساتھ چھاپ دیا جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا مرحوم عبیداللہ سندھی کے ایک عقیدت کیش نے یہ جواب ایک طویل مقدمے کے ساتھ مرتب کر دیا ہے اس مقدمے میں نہ صرف نقاد کے مزاج و سیرت بلکہ برصغیر کے بہت سے علماء صلحاء اور مفکرین اسلام و مدبرین عہد کے متعلق اس کی جماعت کے نقطۂ نظر اور رویے کے ساتھ دیوبند کے مرکز سعادت و انقلاب میں مولانا سندھی کے خلاف بعض اہلِ اغراض کی تحریک مخالفت، ہنگامہ کفر و اسلام اور دارالافتا کے کارنامے کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس واقعے کو پوری تفصیل کے ساتھ پہلی مرتبہ موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ اسی چیز نے معارف کو یہ جرأت دلائی تھی کہ وہ مولانا سندھی کے خلاف یہ تنقید چھاپے۔

ندوۃ المصنفین اور برہان دہلی

دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر نے ہر دور اور علم و عمل کے ہر دائرے میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور ان تمام دائروں میں اپنے نقوشِ فکر و عمل دنیا کے لئے رہنما چھوڑے ہیں لیکن دیوبند کی منظم علمی دعوت اور تحریک کا نام "دارالمصنفین" دہلی ہے۔ اس ادارے کے قیام اور تحریک کو منظم کرنے میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ مولانا سعید احمد اکبرآبادی روزِ اوّل سے شریک تھے۔ ندوۃ المصنفین ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے ذریعے تصنیف و تالیف اور علم و تحقیق کی دعوت

کو عام کرنے اور تحریک کو آگے بڑھانے میں مولانا اکبر آبادی کا حصہ نہایت وقیع ہے۔

ندوۃ المصنفین کے قیام کے ساتھ ہی اس کا علمی ترجمان برہان بھی جاری ہو گیا تھا۔ مولانا اکبر آبادی اسی وقت سے اس کے مدیر تھے۔ اور اپنے انتقال تک وہ اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ "نظرات" کے عنوان سے وہ برہان میں ہر ماہ وقت کے کسی اہم قومی، ملی، علمی، تہذیبی، ثقافتی مسئلے یا کسی نامور شخصیت کے انتقال پر اظہار خیال کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کے قلم سے یہ نظرات ہزارہا صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں جن سے مولانا کے مطالعہ و مشاہدہ، نظر و بصیرت، باریک بینی و ژرف نگاہی۔ تبحر علمی و وسعت مطالعہ اور فکر و انداز کے ترجمان اور ان کے اسلوب تحریر کے شاہ کار ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے برہان میں علمی، تعلیمی، تہذیبی، تاریخی موضوعات و علمی و تاریخی شخصیات پر سینکڑوں مقالے لکھے ہیں۔ اور ملک و بیرون ملک کے دسیوں سفر کے دلچسپ حالات تالیف و شائع فرمائے ہیں۔ ان سب کو مختلف موضوعات کے ذیل میں متعدد مجموعوں میں مرتب کر کے شائع کر دینے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ صرف مولانا اکبر آبادی سے عقیدت و محبت کا ثبوت ہو گا بلکہ یہ بہت بڑی علمی خدمت بھی ہو گی۔

لیکن میرے نزدیک علم و تاریخ کے موضوعات پر مولانا اکبر آبادی کے تحقیقی مقالات سے ان کے نظرات گو زیادہ اہم ہیں علمی و تاریخی موضوعات اور شخصیات پر کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ اور خواہ ہم پسند مولانا ہی کی تحریرات و تحقیقات کو کریں۔ لیکن علمی مطالعے کی بنیادی ضرورت تو کسی کی تحریر سے بھی پوری ہو سکتی ہے لیکن تاریخ ہند پاکستان کے اس ہنگامہ خیز دور میں جو ۱۹۴۸ء سے ۱۹۴۷ء تک پھیلا ہوا ہے اور اس دور کے افکار و حوادث نے مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ پیدا کر دیا تھا جواب تک ختم نہیں ہوا۔ ان پر قومی و ملی تاریخ کے اہم ترین پہلوؤں پر مختلف تحریکوں، حادثوں، واقعوں اور تعلیمی، ثقافتی، سیاسی مسائل و انظار پر مولانا نے اپنے ذوق اور اپنے فکر و انداز کے مطابق جو کچھ تالیف فرما دیا اسے کسی اور اہل علم اور صاحب قلم کی تحریر میں کیونکر تلاش کیا جا سکتا ہے۔

نظرات کے ایک ایک جملے سے مولانا مرحوم کے ذوق کے تنوع، افکار کی رنگینی اور مختلف مسائل اور علوم و فنون میں ان کے گوناگوں خیالات، ذہنی و دماغی خصائص اور علم و نظر کے کمالات کا اظہار ہوتا ہے اور ان کی جامع صفات ہی شخصیت اپنے تمام ذاتی جذبات و امیال اور اپنی پسند و ناپسند کے ساتھ یہیں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور ان کے اسلوب کی دل ربائیوں اور نظر فریبیوں کا واقعی عالم رنگ مع قوریہیں آشکارا ہوتا ہے

سیرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی بلند پایہ عالم دین، مفکر، ادیب، مصنف، محقق، مدرس، علمی خطیب اور گوناگوں ذہنی و دماغی کمالات اور علم و نظر کی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے مطالعے کی طرح ان کا قلب بھی بہت وسیع تھا۔ وہ اخلاق و تواضع کا مجسمہ اور رواداری کی مثال تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم کے ساتھ